تبصرہ کتب

مفتاح اقبال، جلد دوم

مرتب : عبداللہ خاور
ناشر : اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی سری نگر
ضخامت : ۲۹۹صفحات
قیمت : ۲۰۰روپے

گذشتہ تین عشروں سے اقبالیات نے ایک وسیع الاطراف شعبۂ علم وادب کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں بڑی تیزی سے کتابوں، تحقیقی مقالوں اور مضامین کا اضافہ ہو رہا ہے، خصوصاً اقبالیاتی تنقید کے ذخیرے میں مضامین و مقالات کی تعداد نسبتاً روز افزوں ہے۔ کسی تحقیق کار کے لیے مختلف علمی و ادبی رسائل اور تنقیدی مجموعوں میں پھیلے ہوئے اس بڑھتے اور پھلتے پھولتے ذخیرۂ مضامین کو گرفت میں لینا اور اس سے استفادے کی صورت نکالنا کارے دارد۔ اقبالیات کے کسی خاص موضوع پر قبل ازیں کیا کچھ لکھا جا چکا ہے؟ ایک حد تک اس کا جواب کسی اقبالیاتی اشاریے یا کتابیات ہی سے مل سکتا ہے۔ اشاریے، تحقیق اہداف کے حصول میں مدد بہم پہنچا کر تحقیق کار کی مشکلات کو آسان بناتے ہیں۔ اقبالیات پر اب تک متعدد کتابیات اور اشاریے تیار کیے جا چکے ہیں اس کی کچھ تفصیل راقم کی ''کتابیاتِ اقبال'' (لاہور، ۱۹۷۷ء) کے دیباچے اور ایک مضمون ''کلام اقبال کے اشاریے'' (مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ۱۹۸۹ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔۔۔ مضامینِ اقبالیات کے چند اشاریے اس کے بعد بھی چھپے ہیں، مثلاً:

۱۔ ''اقبالیات کا موضوعاتی تجزئی اشاریہ''، مرتبین: زمّرد محمود، محمود الحسن۔ علاّمہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
۲۔ ''اشاریہ سہ ماہی اقبال''۔ مرتبہ: اختر النّساء۔ بزم اقبال، لاہور، فروری ۱۹۹۴ء
۳۔ ''مفتاح اقبال''۔ مرتب: عبداللہ خاور۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر، اگست ۱۹۹۴ء
۴۔ ''موضوع وار اشاریہ مضامین اقبال شناسی'' (بحوالہ کتب) مرتب: قمر عباس۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء

۵۔ *Iqbal and the English Press of Pakistan* ۔ مرتب: ندیم شفیق ملک ۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۹۶ء

۶۔ اشاریہ اقبالیات (اردو، انگریزی، فارسی، عربی، ترکی) مرتب: اختر النساء۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ ۱۹۹۸ء

اوّل الذکر اشاریہ حد درجہ ناقص ہے۔ (اس پر ایک تبصرہ راقم کی کتاب ''اقبالیات کے تین سال'': لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۵۔۱۴۶ میں دیکھا جا سکتا ہے۔)

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، بہت سے اشاریے امتحانی تحقیقی مقالوں کی صورت میں تیار کیے گئے ہیں (ان کی ایک فہرست راقم کی کتاب ''تحقیق اقبالیات کے مآخذ'' (لاہور، ۱۹۹۶ء) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۹۳۔۱۹۹۲ء کے تعلیمی سیشن میں ایم اے اردو (یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور) کے امتحان کی جزوی تکمیل کے لیے دو طالب علموں نے راقم کی نگرانی میں حسب ذیل دو تحقیقی مقالات تیار کیے:

۱۔ اشاریہ تنقید اقبال بحوالہ کتب قمر عباس

۲۔ اشاریہ تنقید اقبال بحوالہ رسائل سید نجف علی

عین اسی زمانے میں کشمیر یونی ورسٹی سری نگر کے اسسٹنٹ لائبریرین جناب عبداللہ خاور بھی ایسی ہی کاوش میں مصروف تھے۔ خاور صاحب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ، قمر عباس کے کام سے بے خبر تھے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں ''یہ موضوعاتی اشاریہ اس نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ برصغیر میں غالباً ابھی تک اس طرح کا کام نہیں ہوا ہے''۔ (ص ۸) بہر حال ان کا مرتبہ اشاریہ ''مفتاح اقبال''، ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ قمر عباس کا محولہ بالا مقالہ اقبال اکادمی لاہور نے اشاریہ مضامین اقبال شناسی کے عنوان سے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا (سید نجف علی کا مقالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔)

قمر عباس کا مقالہ، خاور صاحب کے اشاریے سے پہلے مرتب ہوا، مگر اس کی اشاعت ''مفتاح اقبال'' کے بعد عمل میں آئی۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ کریں بعض دل چسپ نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ قمر عباس نے تقریباً ۵ ہزار مضامین کے حوالے یکجا کیے اور یہ صرف کتابوں سے جمع کیے گئے (رسالوں میں مطبوعہ مضامین کے حوالے انھوں نے سید نجف علی کے لیے چھوڑ دیے) عبداللہ خاور کے ہاں تقریباً ۳۵۰۰ مقالات کی فہرست ملتی ہے (ص ۱۴) یہ حوالے کتابوں کے ساتھ رسالوں سے بھی اخذ کیے گئے ہیں۔

۲۔ قمر عباس نے تقریباً چار سو عنوانات کے تحت حوالے یکجا کیے ہیں۔ عبداللہ خاور کے ہاں عنوانات کی تعداد ۳۳ ہے۔

۳۔ قمر عباس کے حوالوں میں مقالات کی ضخامت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہر حوالے میں مقالے کے صفحات نمبر (مثلاً: از ۱۹ تا ۳۲) بھی دیے گئے ہیں۔ عبداللہ خاور کے ہاں یہ اہتمام نہیں ملتا۔

۴۔ دونوں اشاریہ نگاروں نے بجا طور پر ہر حوالے کے ساتھ کتاب کا نام اور رسالے کے

ساتھ اشاعت کا ماہ وسال بھی دیا ہے۔قمر عباس نے اشاریے کے آخر میں ''کتابیات'' کے تحت ۶۶۳ کتابوں کی فہرست بھی دے دی ہے (مع ناشر وسنہ اشاعت) خاور صاحب کے ہاں یہ اہتمام نہیں کیا گیا۔

بایں ہمہ دونوں اشاریوں کی اہمیت مُسلّمہ ہے،لیکن آگے بڑھیں تو قمر عباس اس کام سے دست کش ہو گئے (شاید دوسری دل چسپیوں میں کھو گئے یا مصروفیات میں الجھ گئے) اور عبداللہ خاور نے اپنے کام کو آگے بڑھایا، چنانچہ حال ہی میں انھوں نے مفتاح اقبال کی دوسری جلد شائع کی ہے۔اس میں پہلی جلد کے ۳۳ موضوعات کے مقابلے میں ۵۰ موضوعات کے تحت پانچ ہزار حوالے مرتب کیے گئے ہیں۔خاور صاحب کے اس اشاریے میں برعظیم پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کے اقبالیاتی ذخیروں کے حوالے یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ بعض پاکستانی کتابوں اور کتابوں سے زیادہ ادبی جرائد کے حوالے بھارتی مطبوعات کے مقابلے میں نسبتاً کم ہیں اور یہ عین فطری بات ہے، اس لیے کہ بھارت اور کشمیر کے اقبالیاتی ادارے، حلقے اور اقبال پر کام کرنے والے سکالر سرحد پار اقبالیاتِ پاکستان کی پیش رفت سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو پاتے۔

عبداللہ خاور صاحب کی زیرنظر کاوش مفتاح اقبال ایک اہم اقبالیاتی حوالہ ہے۔طلبائے اقبالیات خصوصاً اقبالیاتی تحقیق کاروں کے لیے اس کی حیثیت ایک نہایت مفید مآخذ اور معاون کی ہے۔مفتاح اقبال کی قدر و قیمت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ

اوّل: مرتب نے اسے کسی امتحانی مشق (assignment) یا تفویض کردہ کام کے طور پر، یا کسی ڈگری کے لیے نہیں بلکہ فقط اپنے ذوق وشوق اور ایک علمی لگن کی بنا پر یہ مہم انجام دی ہے۔انھیں باقاعدہ نگران یا اقبالیات کے اس شعبے میں مہارت رکھنے والے کسی گائڈ کی راہ نمائی بھی حاصل نہیں تھی۔

دوم: ایک تو وہ بھارت کے علمی مراکز (دہلی، علی گڑھ، پٹنہ، حیدرآباد دکن وغیرہ) سے دور بیٹھے ہیں، دوسری طرف پاکستانی ذخیرۂ اقبالیات (جس کا حجم اور رقبہ بہرحال اقبالیاتِ بھارت سے کہیں زیادہ ہے۔) براہ راست ان کی دسترس میں نہیں ہے۔

کوئی بھی انسانی کاوش کامل واکمل نہیں ہوسکتی، چنانچہ ''مفتاح اقبال'' کی اس قدر و قیمت کے باوجود اسے اور بہتر اور زیادہ پُرافادیت بنانے کے لیے ذیل میں ہم چند تجاویز پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ موضوعات کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا جائے، مثلاً ''مشاہیر'' عنوان کے تحت مختلف شخصیات (جیسے رومی، بیدل، اسد ملتانی، ابوالکلام، سرسید احمد خاں وغیرہ) کے متعلقہ حوالوں کو یکجا درج کیا جائے۔

۲۔ موجودہ صورت میں ہر حوالے میں کتاب کا نام دیا گیا ہے لیکن یہ کتاب کب اور کہاں چھپی؟ اور ناشر کون ہے؟ اس کا پتا نہیں چلتا۔تجویز یہ ہے کہ کتاب کے آخر میں کتابیات شامل کی جائے جس میں ہر محولہ کتاب کے کتابیاتی کوائف (نام مصنف، ناشر، سنہ اشاعت) دیے گئے ہوں۔

۳۔ موجود صورت میں رسائل کے ہر حوالے کے ساتھ مقام اشاعت (لاہور، سری نگر، حیدرآباد دکن

وغیرہ) درج ہے۔ ہمارے خیال میں ہر اندراج میں اس کی ضرورت نہیں۔ حوالے میں تو رسالے کا نام اور ماہ و سال کا اندراج کافی ہے، البتہ کتابیات میں الفبائی ترتیب سے رسائل کی فہرست (نام اور مقام اشاعت) دے دینی چاہیے۔

۴۔ اگر کتابت قدرِ خفی کر دی جائے تو اسی ضخامت میں زیادہ حوالے یکجا ہو سکیں گے۔

۵۔ اگر اشاریے کے آخر میں مقالہ نگاروں کا الفبائی اشاریہ بھی دیا جا سکے (گو یہ ایک خاصا محنت طلب کام ہے) تو مفتاح اقبال زیادہ جامع، سائنٹی فک اور پُر افادیت اقبالیاتی معاون (tool) ثابت ہوگی۔

بہر حال موجودہ صورت میں بھی زیرِ نظر اشاریہ، اقبالیات کے حوالہ جاتی ذخیرے میں ایک نہایت مفید اضافہ ہے اور ہمیں توقع ہے کہ مرتب اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے، جب تک ممکن ہو، مزید جلدیں تیار کرتے رہیں گے۔

تبصرۂ کتب:

نام کتاب	:	فہارس تحلیلی ہشتگانہ
تحقیق	:	آرثور بیولر
قیمت	:	۱۵۰روپے پاکستانی ۱۰ڈالرامریکی
ناشر	:	اقبال اکادمی پاکستان
مبصر	:	محمد خلیل صدیقی مجددی

نفس مضمون اور مواد (Matter) کے اعتبار سے یہ کتاب نہایت اہم ہے بلکہ اسلام کی اشاعت کے لیے عمدہ کاوش ہے۔حضرت ابوالحسن زید فاروقیؒ فرماتے ہیں۔''حضرت کے مکتوبات قدسی اکسیر ہدایت ہیں'' پروفیسر محمد فرمان نے لکھا ہے کہ ''آپ کی دو بڑی کرامتیں دنیا کے لیے بڑے فیوض و برکات کا باعث ہوتی ہیں۔ایک آپ کی نیک وصالح اولاد ہے جن میں سے ہر ایک یگانۂ روزگار تھا.....دوسری کرامت جناب کے مکتوبات ہیں جن کے مطالعے سے آپ کی علمیت،خلوص اور شرع کی پابندی کا ایک حسین،دلکش اور مستحکم منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے،جس سے پڑھنے والا اپنے دل میں سرور اور سوز محسوس کرتا ہے اور مزاج وافعال میں نمایاں تبدیلی پاتا ہے''۔

اس کاوش جلیلہ ''فہارس تحلیلی ہشتگانہ'' جیسی کتاب کے سلسلے میں حضرت ابوالحسن زید فاروقی مجددیؒ فرماتے ہیں۔''حضرت محمد عبداللہ جان معروف بہ شاہ آغا،ساکن ٹنڈہ سائیں داد ضلع حیدرآباد سندھ،متوفی ۱۳۹۳ھ نے مکتوبات کا انتخاب بہ اعتبار مضامین کیا ہے۔انہوں نے چار ابواب قائم کئے ہیں۔پہلا اصول عقائد اہل سنت و جماعت کا،دوسرا مسائل واحکام کا،تیسرا حقائق وانوار اور اذواق ومواجیہ کا،چوتھا مواعظ و نصائح کا اور اس کا نام ''فیض البرکات من عین المکتوبات'' رکھا ہے۔کتابی تقطیع پر ۴۹۲صفحات کی کتاب ہے۔

چونکہ انتخاب فارسی میں ہے، اس لیے حضرت مجددؒ ہی کی عبارت ہے۔ اگر حضرت محمد عبداللہ جانؒ تمام مکتوبات کو بالاستیعاب بہ اعتبار ابواب لکھتے اور کچھ مزید ابواب کا اضافہ کرتے تو نہایت اعلیٰ کام ہوتا''۔

مزید فرماتے ہیں۔ ''میں نے سنا ہے کہ ہندوستان میں ایک پروفیسر مکتوبات کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں۔ وہ اس کام میں دو تین سال سے مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب فرمائے''۔

آخر میں فرماتے ہیں۔ ''حضرت مجددؒ کے مکتوبات کا، جس زبان میں بھی ترجمہ ہوگا، اسلام کو تقویت ملے گی۔ جو بھی آپ کے مکتوبات کو پڑھے گا، اس کے سامنے اسلام اور اسلامی تصوف کا صحیح نقشہ آئے گا''۔

غلام آں کلماتم کہ آتش افروزد
نہ آبِ سرد زند در سخن بر آتش تیز
فقیر و خستہ بہ درگاہت آمدم رحمے
کہ جزو لائے توام نیست ہیچ دستاویز

مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ سے متعلق متعدد دل چسپ کتابیں ملتی ہیں مثلاً ''کنز الہدایات'' جو حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے خلیفہ خاص مولانا محمد باقر لاہوریؒ کی تالیف ہے۔ انہوں نے مکتوبات میں سے عبارات اخذ کر کے طریقۂ نقشبندیہ کو بطریق احسن بیان فرمایا ہے۔ دوسری کتاب ''ارشاد الطالبین'' ہے جو حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی عثمانی مجددیؒ کی تالیف ہے۔ اس میں طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کو مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کی روشنی میں بیان فرمایا ہے۔ یہ دونوں کتب فقیر حقیر کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

اس سلسلے میں راقم الحروف اور برادر بزرگ جناب محمد یوسف مجددی مرحوم نے مشترکہ کاوش کی اور مضامین مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کو کافی حد تک ترتیب دیا۔ یہ کتاب قریباً ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن برادر بزرگ کا انتقال ہو گیا اور میں کچھ علیل رہا۔ سردست یہ کام معرضِ التواء میں پڑا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس ادنیٰ سی کاوش کو اس صورت میں قبول و منظور فرمائے کہ اس کی تکمیل و اشاعت کے اسباب مہیا ہو جائیں تاکہ جتنی کاوش کی ہے، وہ تو اسلام کے شیدائیوں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عقیدت مندوں کے استفادہ و استفاضہ کا باعث ہو۔ حسب ارشاد مَالَا یدرُکُ کُلّہٗ لَا یَشرکُ کُلّہٗ۔ جو میسر آ جائے اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ آمین بہ حُرمت سید المرسلین عَلَیہِ الصّلوٰۃ اَتَمُّھَا وَ التَّحِیَّۃُ اَکمَلُھَا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ پر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور باقی رہے گا۔

مکتوبات شناسی کے لیے صرف فارسی جاننا ہی کافی نہیں۔ اس کے طالب و سالک کا، دینی علوم و معارف کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ درویش لاہوری حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔ ؎

نہ ہر کس کہ سر بتراشد قلندری داند

اگر مکتوبات دانشور کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ اِسے ایک دانشور کی تحریر سمجھے گا۔ مفکر، فلسفی، ادیب، مصنف اور عالم اپنی اپنی علمیت کے پیمانے پر پرکھے گا۔ صوفی اپنے تصوف کے انداز میں ٹٹولے گا۔ لیکن

مکتوبات ہمہ جہت، جملہ مقاصد کی حامل اور جامع تحریر ہے۔ مونالزا (Monaliza) اس لیے عجوبہ روزگار ہے اور عجائباتِ عالم میں سرفہرست سمجھا جاتا ہے کہ اس کا خالق کہتے ہیں کہ چھتیس علوم وفنون کا ماہر تھا۔ لیکن ہزار سالہ مجدد، اس سے زیادہ علوم ومہارات کا ماہر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی جہتوں کا تعین وشمار ممکن نہیں۔ مکتوبات کی حقانیت کے بارے میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے اپنے بیان کردہ، فرمودہ شواہد موجود ہیں۔

۱۔ الہامات رحمانی۔ اے فرزند این معارف کہ مسودہ یافتہ است، اُمیّد است کہ از الہامات رحمانی باشند کہ اصلاً شائبہ وساوس شیطانی را در انجا مجال نبود۔ دلیل بریں معنیٰ آں دارد کہ چوں در صدد تحریر ایں علوم شدم ملتجی بجناب قدس خداوندی جَلَّ سُلطَانُہٗ کَشت، دیدکہ گویا ملائکہ کرام علیٰ نَبِیِّنَا وَ عَلَیھِمُ الصَّلوٰۃُ وَ السَّلاَمُ از نواحی آں مقام دفع شیطان میکردند و نمے گزاشتند کہ در حوالۂ آں مکان بگردد۔ وَاللّٰہُ سُبحَانَہٗ اَعلَمُ بِحَقِیقَۃِ الحَالِ۔ (مکتوب ۲۳۴۔ دفتر اوّل)

۲۔ ہمہ مقبول ومنظور۔ دفتر سوم کے دیباچہ میں تحریر ہے۔ ''حضرت از غایت انکسار وخشیت در جواب (سوالے) فرمودند۔ ایں ہمہ علوم کہ تبیین وتحریر یافت، دراں حیرتم کہ آیا مقبول ومرضی بوند یا نہ آنگاہ خاموش گشتہ مترصدِ بشارت وائسارت گشتند۔ فردائے آنروز فرمودند کہ دوش ندا در دادند وظاہر ساختند کہ ایں ہمہ علوم کہ نوشتہ، بل ہر چہ در گفتگوئے تو آمدہ، ہمہ مقبول ومرضی است۔ واشارت بنوشتہائے من کردہ فرمودند ایں ہمہ ما گفتہ ایم و بیان ما است و دراں وقت ہمہ آں علوم بنظر من نیز داشتند و من بر یک یک اجمالاً وتفصیلاً نظر میکردم۔ سیمّا در علومیکہ وقتے مرا در آنہا تردے بود، ہمہ را دراں حکم داخل یافتم۔ اَلحَمدُللّٰہِ عَلَی الاِحسَان۔

۳۔ خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد۔ ''حضرت خواجہ ما قدس سرہٗ نوشتہ بودند کہ علوم شما ہمہ صحیح است'' (مکتوب ۱۰۷۔ دفتر اوّل)

۴۔ مکتوبات سے امام مہدی حظِ وافر اٹھائیں گے۔ فرمایا۔ ''سُبحَان اللّٰہ! معارضے کہ از یں حقیر (حضرت مجدد الف ثانیؒ) بخواست بظہور مے آید، اگر اکثرے جمع شدہ در تصویر آں کوشند، معلوم نیست کہ میسر شود۔ مانا کہ حظِّ وافر از یں معارف نصیب حضرت مہدی علیہ الرضوان خواہد بود ؎

اگر بادشہ بر در پیر زن
بیاید تو اے خواجہ سُبلت مکن

(مکتوب ۲۳۴۔ دفتر اوّل، ص ۳۸۸)

۵۔ رسول اللہ ﷺ کی تحسین۔ وآں رسالہ بالتماس بعضے یاران میسر شدہ۔ التماس نمودہ بودند کہ نصائح بنویسیر کہ در طریقہ نافع باشد وبمقتضائے آں زندگانی کردہ شود۔ الحق رسالۂ غیر مکرّر کثیر البرکات است، بعد از تحریر آں چناں معلوم شد کہ حضرت رسالت خاتمیت علیہ الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ با جمعے کثیر از مشائخ اُمتِ خود حاضر اند وہمیں رسالہ در دستِ مبارکِ خود دارند واز کمالِ کرم خویش آں را بوسہ مے کنند وبہ مشائخ مینمایند کہ ایں نوع معتقدات می باید حاصل کردد جماعہ کہ بایں علوم مستعد گشتہ بودند نورانی وممتاز اند وعزیز الوجود، در رو بروئے آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ ایستادہ اند۔ والقصۃ بطولھا۔ ودر ہماں مجلس باشاعت ایں واقعہ

حقیر را امر فرمودند۔

باکریماں کارہا دشوار نیست

(مکتوب ۱۶۔دفتر اوّل، ص ۳۵)

۶۔ حضرت علیؓ کی تائید۔ایک سید عالم رات کو مکتوبات کا مطالعہ کر رہا تھا۔دوران مطالعہ کسی عبارت پر اُسے طیش آیا۔مکتوبات کو زمین پر ڈال دیا اور سو گیا۔وہ عبارت مناقشت و محاربت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں تھی۔خواب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ جلال میں تشریف لائے اور فرمایا۔''اے طفل نادان! تو ہماری تحریر پر اعتراض کرتا ہے۔آ میں تجھے حضرت علیؓ کی بارگاہ میں لیے چلتا ہوں'' جب اُن کی بارگاہِ اقدس میں پہنچے تو آپؓ نے فرمایا۔''خبردار! ہزار بار خبردار! حضور ﷺ کے اصحابؓ سے اپنے دل میں بغض نہ رکھنا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی بات کا انکار مت کرنا''۔حضرت مجددؒ نے پھر عرض کی ''حضرت! اس کا دل اب بھی صاف نہیں ہوا''۔تو وہ بیان کرتا ہے کہ حضرت علیؓ کے ارشاد کے مطابق حضرت مجددؒ نے میری گدّی پر تھپڑ مارا۔اسی وقت میرا دل اس کدورت سے صاف ہو گیا۔اور مجھے حضرت مجددؒ اور اُن کے کلام سے عقیدت و محبت پیدا ہو گئی۔(ملخصاً) (حضرات القدس کرامت ۱۰)

۷۔ اجازت نامۂ رسول اللہ ﷺ۔بعد از حلقۂ صباح چوں کوفت شب داشتہ بود، بخواب رفت، مے بیند کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ از برائے فقیر اجازت نامہ نوشتہ اند، چنانچہ عادتِ مشائخ است کہ خلفاء را مے نویسند۔و یکے از یاران جہت مندمن دریں معاملہ است۔دریں اثناء گویا ظاہر گشتہ است کہ در امضائے ایں اجازت نامہ مخوے از فتور است۔و تعین وجہ فتور ہمدراں وقت معلوم است۔آں یار کہ متصدی ایں خدمت است بار دیگر گویا ایں اجازت نامہ را در ملازمت آں سرور بردہ است عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہِ الصَّلَوَاتُ وَ التَّسْلِیْمَاتُ۔وآں سرور در پشت آں اجازت نامۂ دیگر نوشتہ اند یا نویسانیدہ۔ایں تشخص نشدہ۔اما نسبت بآں سرور معلوم ست۔و بعد از نوشتن بمہر خود مزین فرمودہ اند عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام۔مضمون ایں اجازت نامہ آنست کہ در عوض اجازت نامۂ دنیا، اجازت نامۂ آخرت دادہ اند۔واز مقام شفاعت نقیب عنایت فرمودہ اند۔وکاغذ ہم طولانی ست وسطر ہائے بسیار نوشتہ اند۔(مکتوب ۱۰۶۔دفتر سوم)

طوالتِ مضمون کے خوف سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

اب کہاں سے ہمہ جہت شخصیت پیدا ہو جو مکتوبات کا کماحقّہٗ ادراک کر سکے۔حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں ان کے ہمعصر، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

۸۔ وجز آں معارف جدیدہ و حقائقِ نادرہ کہ از اں قلم نورانی رقم ریختہ، آفتابے ست کہ چشم منکراں از اں خیرہ و روزِ حاسداں تیرہ۔ایں معارف و حقائق کہ می شنوی و ایں ہدایت و ارشاد کہ می بینی باعلی ندا ندامے کند کہ صاحبِ آں مجدد است۔و نہ مجدّد مائتہ بل مجدّد الف، صد تا ہزار فرقی نہ اندک ست، لو کُنْتُمْ تَعْلَمُوْن۔

(اخبار الاخیار فارسی۔ص ۳۲۵)

۹۔ اس ضمن میں آخری کلمات حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی زبانی سنیں۔ عبارت عربی میں ہے اس لیے ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کا طریقہ اور اس کی جو عادت مستمرہ اپنے انبیاء کے ساتھ رہی ہے، اسی کو اس نے امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ برتا ہے کہ ظالموں اور مبتدعین نے آپ کو ایذا پہنچائی۔ اور متقشف فقہا نے آپ کا انکار کیا، تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی حسنات میں اضافہ ہو۔ مومن ہی کو آپ سے محبت ہوگی اور شقی فاجر ہی کو آپ سے عداوت۔ (ترجمہ احوال الامام الربانی۔ برحاشیہ مکتوبات عربی)

۱۰۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے بارے میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ تحریر فرماتے ہیں:

قدح کردن در سخن بزرگان بے مرادِ ایشاں جہل است و نتیجہ نیک نہ دارد۔ پس رد کلام مشیخت پناہ، عرفان دستگاہ شیخ احمد از جہل و نافہمیدگی است۔

(ہدیہ مجددیہ کہ از رسالہ کشف العظاء نقل کردہ۔ از حضرت محمد فرخ نبیرۂ حضرت مجددؒ)

دانشورانہ، مفکرانہ، ادیبانہ، مصنفانہ اور عالمانہ فکر کے حامل حضرات نے ''فہارس تحلیلی ہشتگانہ'' مکتوبات امام ربانی حضرت مجدّد الف ثانیؒ کتاب میں، آپ کو حضرت یا شیخ لکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ محض احمد سرہندی سمجھا ہے:

چمن میں میری تلخ نوائی گوارا کر
کہ کبھی زہر بھی کرتا ہے کار تریاقی

ہر شخص کی شخصیت اس کے مقامات و درجات سے پہچانی جاتی ہے۔ محض نام سے نہیں، نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اگر ہم رسول اللہ ﷺ کو مستشرقین (Qrientalists) کی طرح محمد مکّی یا محمد عربی کے نام سے یاد کریں یا تحریر کریں کہ کیسے واضح ہوگا کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ بھی ان کو نام سے کم، اور ان کے صفات و مقامات و درجات سے زیادہ یاد اور ذکر فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ، ہمیں تعلیم و تدریس مہیا فرماتا ہے کہ محض آپ کے سرسری نام سے نہیں، بلکہ آپ کے صفات و کمالات سے یاد تحریر کرنا چاہیے۔ میاں احمد سرہندی کہہ کر آپ نے اُن کے جائز مقام و درجہ سے اغماض فرمایا ہے۔ اس سے ان کا اُمت رسولؐ میں درجہ و مقام اجاگر نہیں ہوتا۔ اور نہ دانشور کی دانشوری کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ احمد سرہندی کے نام سے نہیں، حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے اسم گرامی و لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔ جو حضرات آپ کو سرسری ہزار سالہ مجدد نہیں مانتے وہ بھی لفظ مجدّد لکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ معلوم نہیں آپ حضرات ایسے لقب سے کیوں گریز پا ہیں۔ آپ حضرات کے محض احمد سرہندی لکھنے پر اکتفا کرنے سے ان کے عظمت و وقار میں کمی نہیں آئے گی:

حضرت مجدد الف ثانیؒ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نائب، خلیفہ اللہ اور خلیفۃ الرسول ہیں۔ اولوالعزم رسول، جو صاحبِ کتاب، صاحب و شریعت ہوتا ہے، کے قائم مقام ہیں۔ آپ اپنے مکتوبات قدسی آیات میں فرماتے ہیں کہ سو سالہ مجدد نبی کا قائم مقام اور ہزار سالہ مجدد اولوالعزم رسول کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اسی لیے امام مہدیؑ اس امت کے سو سالہ مجدد نہیں، ہزار سالہ مجدد بن کر مبعوث ہوں گے۔ یاد رہے کہ ہر مجدد

مبعوث و مامُور بن اللہ ہوتا ہے۔ضروری خیال کریں تو مجدد والی حدیث کے الفاظ پر غور فرمالیں۔

اس عظیم کاوش اور کارنمایاں کو سرانجام دے کر اسے چار چاند لگانے کی بجائے اسے خاک میں ملانے کی سعی نا تمام کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَیٰ الْقُلُوْب۔

کتاب کی کتابت انتہائی باریک اور تمام ترنسخ میں ہے۔اس جدید ترقی یافتہ دور میں ایسی کتابت اور ضرورت سے زیادہ کفایت شعاری کو کون پسند کرتا ہے۔ہم جیسے ضعیف العمر اور ضعیف البصر لوگ تو چشمہ سے بھی بدقت نظر اس کا معالعہ کرسکیں گے۔

آئندہ ایڈیشن میں ان کوتاہیوں کا ازالہ لازمی ہے۔

نام کتاب: اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ
مصنف : پروفیسر ایوب صابر
صفحات : ۳۸۷
قیمت : ۳۰۰ روپے
ناشر : انسٹی ٹیوٹ آف اقبال سٹڈیز، بیت الحکمت، لاہور
مبصر : محمد سہیل عمر

انسان اپنی اجتماعی بلکہ نوعی ساخت میں ایک شخصیت کی طرح ہے جس کی تشکیل انہی عناصر سے ہوتی ہے جو فرد کی تعمیر میں کارفرما ہوتے ہیں۔ وہ روایت جو انسانیت کی حقیقت کا تعین کر کے اسے شعور، ارادے اور طبیعت میں راسخ کرتی ہے، اپنے اظہار کی غیر پیغمبرانہ سطحوں پر بھی افراد ہی کو مظہر بناتی ہے۔ ان میں سے بعض افراد اپنی ذات کے ہر جز میں اس مظہریت کی ذمہ داری نبھاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو اس روایت کے ترجمان بن کر اسے تغیر و تبدیلی پر اساس رکھنے والی انسانی صورت حال میں نہ صرف یہ کہ اوجھل نہیں ہونے دیتے بلکہ زندگی کے سب سے بنیادی اور حقیقی اصول کے طور پر اس کو نفسِ انسانی کی سطح پر قائم اور محفوظ رکھتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ حضرات آتے ہیں جو اپنی ذات میں بھی انسانیت کا معیار ہوتے ہیں، یعنی ائمہ و اولیا، وغیرہ۔ جبکہ دوسری قبیل ان لوگوں کی ہے جن کا قول ہی اتنا زندہ، بامعنی اور پُر اثر ہوتا ہے کہ ان کے احوال و اعمال میں موجود جزوی نقائص سرے سے غیر اہم اور ناقابلِ اِلتفات ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انسانی تکمیل کا مجموعی عمل گو کہ اپنی روح میں حال سے عبارت ہوتا ہے، تاہم اس کے بعض مطالبات قال کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ انسان کی باطنی اور خارجی پیش رفت جب اجتماعی اسلوب اختیار کرتی ہے تو اس کے بنیادی محرکات اور حتمی مقاصد کو مستحضر رہنے کے لیے لفظ کا وسیلہ درکار ہوتا ہے جو فکر و تخیل اور جذبہ و احساس کی تشکیل میں ایک فیصلہ کُن کردار رکھتا ہے۔

لفظ، آدمی کی سب سے بڑی قوت ہے۔ شاعروں اور مفکروں کے ہاں یہ قوت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ عام طور سے ان کی شخصیت، خصوصاً کردار کے اعتبار سے، اس کا پورا مصداق بننے سے قاصر رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک کمی ہے، لیکن دیانت داری سے دیکھا جائے تو بعض شعرا اور مفکرین میں یہ کمی شخصیت کی کسی منافقانہ یا مریضانہ دوئی پر دلالت نہیں کرتی بلکہ انسان کی کچھ مجبوریوں کا ایک لائق فہم اور قابل

قبول مظہر ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ اس طرف اشارہ کر دیا جائے کہ بعض شخصیتیں اپنی قوم کے لیے معیار بن جاتی ہیں۔ یہ معیار ذاتی کردار کی بنیاد پر بھی ہوسکتا ہے اور خیال وفکر کی وجہ سے بھی۔ قومی زندگی کی بقا اور کمال کے لیے دونوں طرح کے معیارات کا موجود اور محفوظ رہنا ضروری ہے۔

ہم اپنی صورت حال پر نظر کریں تو ہمارے موجودہ تصور زندگی اور مروجہ اقدار حیات میں قائداعظم کی شخصیت اور علامہ اقبال کے پیغام کی حیثیت مرکزی ہے۔ ہماری قومی زندگی کی صورت گری میں کردار و گفتار کی بیشتر ضروریات انھی دو ہستیوں کو نمونہ بنا کر پوری ہوئی ہیں۔ فرد کی طرح قوم بھی ذہن، مزاج اور ارادے کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں یکجائی اور یکسوئی کے حصول کے لیے نظریے اور عمل کے قطبین میں توازن پیدا کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ اگر نظریاتی ساخت کو مستحکم کرنے والا عنصر بالفرض عملی مطالبات کی تکمیل نہ کر سکتا ہو تو قومی زندگی میں اسے ایک اساسی قدر کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی اس ناگزیر حیثیت کو مجروح کرنے کی ہر کوشش اپنی بنیاد منہدم کرنے کے مترادف ہے۔

اس بات پر شبہ کرنے کے لیے دانش وبینش سے مکمل محرومی درکار ہے کہ جنوبی ایشیا کے اکثر مسلمانوں کا نظریاتی جوش اور فکری اطمینان جن بنیادوں پر استوار ہے اور استوار رہ سکتا ہے، ان میں ایک بڑی بنیاد اقبال کے خطبات اور شاعری نے مہیا کی ہے۔ کم از کم مسلمانان برصغیر نے اب تک وہ دفاعی نظام ایجاد نہیں کیا جو ان کے دین، تہذیب اور نفسیات کو محفوظ رکھنے میں کلام اقبال سے زیادہ نہ سہی، اُس کے برابر ہی مؤثر اور قابل اعتماد ہو۔ علامہ کی اس منفرد حیثیت کو ان کی شخصیت پر کیے گئے منفی تجزیوں کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ ان کا یہ مقام ان کے کلام کی وجہ سے ان کی شخصیت سے ماورا ہے۔

نظریے اور عمل کا جو توازن قوم کا مدارِ ہست وبُود ہے، ہم نے اسے اقبال کی فکر اور شاعری سے اخذ کیا ہے، ان کی شخصیت سے نہیں۔ ان کا مردِ کامل ہمارے لیے مثالی نمونہ ہے مگر ہمارے اندر اس خیال نے کبھی سر نہیں اٹھایا کہ خود اقبال اپنے ''مردِ کامل'' کا مصداق ہیں یا انھیں ہونا چاہیے۔ علامہ سے محبت اور ان کا احترام ہمیں اس طرف نہیں لے جاتا کہ انہیں اس نظر سے دیکھنا شروع کر دیں جس نظر سے دینی اور روحانی کمالات کے حاملین کو دیکھا جاتا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان کی ذات سے وہ گراوٹ اور گھٹیا پن منسوب کر دیا جائے جو عام سے عام آدمی کے لیے بھی باعثِ شرم ہو۔ ولی اللہ نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ آدمی کو عیب جوئی کا ہدف بنا لیا جائے۔ دین داری اور اتباعِ سُنّت کے بعض اعلیٰ معیاروں پر پورا نہ اتر سکنے کے باوجود عین ممکن ہے کہ ایک شخص ایسے اوصاف اور ایسی صلاحیتوں کا مالک ہو جو اربابِ صلاح اور اصحابِ تقویٰ کے لیے بھی لائق رشک ہوں۔ اس امکان کی صحت کا سب سے بڑا ثبوت خود اقبال ہیں۔ ملّت اسلامیہ کے جسد مردہ میں روح پھونکنے کا جو کام انہوں نے کیا ہے، وہ کسی بھی مجدّد اور مصلح کے لیے سرمایۂ افتخار ہوسکتا ہے اور پھر یہ کارنامہ وقت کے کسی خاص حصے تک محدود نہیں ہے۔ انسانوں کے قلوب میں یقین پیدا کرنے کے جتنے اسباب ممکن ہیں، ان سب کو بروئے کار لا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل بعید میں بھی اُمّتِ مُسلِمَہ میں بیداری کی

جولہریں اٹھیں گی، ان میں سے اکثر اقبال کے سرچشمۂ فکر ہی سے نکلی ہوں گی۔

اقبال کی یہ مسلمہ حیثیت ہی ان کی شخصیت کا سب سے بڑا بلکہ واحد عنوان ہے۔ اس سے واقف ہو جانے کے بعد کسی شخص کو، بشرطیکہ وہ آدمیت سے بالکل ہی محروم نہ ہو، یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اقبال کی چھوٹی موٹی کمزوریاں تلاش اور مزے لے لے کر بیان کرنے بیٹھ جائے۔ اس طرح کا نفسیاتی مطالعہ ناکام و نامراد لوگوں کو سمجھنے کے لیے تو مفید ہوسکتا ہے لیکن اقبال ایسی شخصیت پر اس کا اطلاق ایسے ہے، جیسے کوئی مستری ہمالہ کی ساخت کے نقائص ڈھونڈنے میں لگ جائے۔ سامنے کی بات ہے کہ نفسِ انسانی کو جمال و جلال اور خیر و کمال کے اصلی اور قدرتی سانچے میں ڈھالنے کی قوت رکھنے والی کوئی ہستی اتنی گئی گزری نہیں ہوسکتی کہ کوڑا کرکٹ چننے اور گندگی کریدنے والی مخلوق اس پر حرف زنی کر سکے۔ اقبال کی شخصیت میں یقیناً کئی کوتاہیاں اور کمزوریاں ہوں گی۔ ان کی نوعیت ذاتی بھی ہوسکتی ہے اور علمی و فکری بھی۔ لیکن وہ معائب و نقائص ان کے کمالات کے آگے گویا معدوم ہیں۔ اُنھیں حاضر و موجود کرنے کی جو بھی کوشش کی جائے گی، وہ بجائے خود ایک پست، گھٹیا اور مسخ نفسیات کی آئینہ دار ہوگی۔

''اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ'' کی شہرت اس کی اشاعت سے ایک قدم آگے رہی ہے۔ کتاب کا مسودہ مجھے بھی بعد میں پہنچا اور اس پر رائے زنی اور سنی سنائی باتوں کا فشردہ پہلے وارد ہوا۔ کتاب دیکھنے سے قبل اندیشہ یہ تھا کہ پروفیسر ایوب صابر کا یہ کام کہیں اقبال دشمنی کے رجحان کو مزید حوالہ جات فراہم کر کے اس کی تقویت کا سبب نہ بن جائے۔ لیکن جب کتاب کا مسودہ ہاتھ میں آیا اور میں نے اس کا مطالعہ کیا تو وہ اندیشہ رفع ہوگیا۔ پروفیسر صاحب کا یہ کام بلاشبہ بہت سے فوری بہت سے دوررس فوائد رکھتا ہے۔ اقبال کو جن معاندانہ اعتراضات، الزامات اور اتہامات کا نشانہ بنایا گیا ہے، عوام و خواص کی ایک اچھی خاصی تعداد انھیں درست یا تقریباً درست سمجھتی ہے اور اس سلسلے میں خاموش رہتی ہے۔ اس طبقے میں اکثریت یقیناً ایسے لوگوں کی ہے جو شراب نوشی وغیرہ کو علامہ کا ذاتی فعل کہہ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ مہربانی ہمیں اقبال کا وہ حق ادا کرنے سے نہیں روک سکتی، جو ہم پر واجب ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے محسن کی کردار کشی اور اہانت کی ہر مہم کا مقابلہ کریں تاکہ اقبال سے ہمیں جو نسبت ہے، وہ ہر لحاظ سے بے داغ، بے غُبار اور محکم رہے۔ یہ ہماری ذاتی ضرورت اور قومی تقاضا ہے۔

پروفیسر ایوب صابر اقبال دشمنی کی پوری روایت کو، اس کی تمام صورتوں کی پردہ کشائی، اس کی نارسائیوں کا آئینہ دکھانے اور اس کی کج فہمی، کج بینی اور کج نویسی کی تردید و اصلاح پر کمربستہ ہیں۔ ان کا یہ منصوبہ کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ زیرنظر کتاب کا موضوع ہے: ''اقبال کی شخصیت پر کیے جانے والے اعتراضات کا تحقیقی جواب''

یہاں اعتراضات کا تار و پود جس طرح بکھیرا گیا ہے، وہ اپنی جگہ ایک چشم کشا مطالعہ ہے۔ اعتراضات کی ایک نوع تو ایسی ہے کہ اس کی تردید کے لیے صرف اسے نقل کرنا کافی ہے۔ یہ اعتراضات داخلی تضادات سے بھرپور واشگاف غلطیوں کا مرقع اور حکایت باقی کا نمونہ ہیں۔ ان کی تردید میں کچھ لکھنے کی

ضرورت ہی نہیں رہتی کہ یہ کام ان کی عبارت خود ہی بخوبی انجام دے رہی ہے۔ان کے معاملے میں گِلِ کُوزہ سے لے کر کوزہ شکنی کے جملہ مراحل کا سامان ان کی اپنی تعمیر میں مضمر ہے۔

کچھ اعتراضات افسانہ اور حقیقت، فکشن اور سچی واردات کا ملغوبہ ہیں۔ بافندگان حرف وحکایت نے کہانی کا تانا بانا بنتے بنتے اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ملا کر اس کا رنگ، رخ اور ''ذائقہ'' بدل دیا ہے۔ پھر ان اقبال شناسان خام کار کے خامۂ ہذیان رقم اور خود بین وخود آرا نے ایسی مطلق العنانی اور بسا اوقات مطلق الانانیت دکھائی ہے کہ کہانی کہتے کہتے خود کہنے والے کو کچھ ہو گیا ہے اور وہ اپنے زورِ تخیل سے اقبال کا ماضی اور اپنا مستقبل آپ بنانے نکل کھڑا ہوا ہے۔

بعض اعتراضات میں تو ''اجتماعی کاوشوں'' کی عجب رنگارنگی نظر آتی ہے۔ایک کہانی کار داستان کا ست رنگا تانا بانا بنتا ہے، دوسرا اس پر زردوزی کام کے بیل بوٹے بناتا ہے، تیسرا کلی پُھند نے ٹانکتا ہے۔ پھر سب مل کر غیبت بافی کا شاہکار جھول جسدِ اقبالیات پر ڈال دیتے ہیں۔

یہ ماضی وہ نہیں ہوتا جو واقعتاً تھا، بلکہ وہ جو داستان طرازوں نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سرِ نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہوتا ہے۔اقبال اور اقبالیات کا ''ماضی تمنائی'' اس پاستان طرازی کے پس منظر میں ان اقبال شناسوں کی مجروح انا کا طاؤسی رقص دیدنی ہوتا ہے کیونکہ پھر یہ اعتراضات صرف نقد ادب وشعر یا سوانحی تجزیہ نہیں رہ جاتے بلکہ ہمارے رویوں کا آئینہ بن جاتے ہیں۔اس آئینے میں کیسے کیسے عکس ابھرتے ہیں۔شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں تراشتی ہے، یہ لکھنے والے کے ذوق، تاب ہزیمت اور طاقت فرار یا خوئے انتقام پر منحصر ہے۔

جن لوگوں کا تصور شعر اور مقیاس الشعرا، مضافاتی یا قصباتی نوعیت کا ہے، وہ اقبال کی شاعری کو اسلامی تہذیب کے جمال وزیبائی کا نمونہ جاننے کی بجائے اسے اپنے اسی دہقانی پیمانے پر ناپتے رہے ہیں۔ان کی نارسائیوں کا عکس آپ کو کتاب میں جا بجا ملے گا۔ان بزرگوں کا کارنامہ بھی نظر آئے گا جو اپنے کسی عیب کا جواز اقبال کی زندگی کے مفروضہ مخفی گوشوں میں تلاش کرتے پائے جائیں گے۔ وہ ذہن بھی منعکس ہوگا جو گھٹیا الزامات اور عیب جوئی سے لذت کشید کرتا ہے اور بڑے آدمی کی، بزعم خویش، تذلیل کر کے مسرت حاصل کرتا ہے۔مسلک کا اختلاف کیونکر عظمت کے اعتراف میں حائل ہوتا ہے، یہ منظر بھی بار بار سامنے آئے گا۔

اعتراضات کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس کا خمیر غلطی یا ناکافی معلومات سے اٹھا ہے۔کتاب کی سب سے بڑی افادیت اسی نوع کے اعتراضات کی تصحیح، ترمیم اور تردید میں مضمر ہے ورنہ اہل عناد کا مرض تو درد لا دوا ہی پایا گیا ہے۔ وہ قارئین، جن کی قِلّتِ معلومات اور عقیدت کے مابین ایک کشاکش رہتی ہے، اُنھیں اس کتاب کی صورت میں ایک مضبوط سہارا میسر آ جائے گا۔صرف اتنا ہی نہیں، کتنے ہی اعتراضات ایسے ہیں جن کا شافی جواب خود ہمیں بھی ڈاکٹر ایوب صابر کے توسط سے حاصل ہوا اور صُورتِ مسئلہ پوری طرح واضح ہو گئی۔اس خارستانِ جرح ونقد میں ہم ایسے اور بھی بہت سے قارئین ہوں گے جن کے لیے اس کتاب سے استفادہ گوناگوں فوائد رکھتا ہوگا۔مطالعہ شرط ہے۔

الغرض، علامہ کی شخصیت پر اب تک جتنے اعتراضات اور الزامات عائد کیے گئے ہیں، پروفیسر ایوب صابر نے ان سب کا سامنا کیا ہے، دیکھا پرکھا ہے اور ایک ایک کا جواب دیا ہے۔ اکثر جوابات اور توضیحات محکم، مدلل، مسکت اور برمحل ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مزید تشفّی درکار ہے۔ اسی طرح ایک آدھ جگہ پر کسی اختلافی نکتے کو بھی معاندانہ اعتراض فرض کر لیا گیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی یہ شکایت کہ اقبال، مغرب دشمنی میں حد سے گزر جاتے ہیں اور سلیم احمد کی یہ دریافت کہ ان کی شاعری کا مرکزی مسئلہ 'موت' ہے، اقبال دشمنی کا مظہر نہیں ہے۔ ان پر گفتگو کی سطح اور اسلُوب بالکل مختلف ہونا چاہیے۔ یہ خاصے سنجیدہ مباحث ہیں۔ تاہم کچھ کھانچوں کے باوجود اقبال کی شخصیت کا ایسا ٹھوس اور متوازن دفاع اقبالیات کی روایت میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

پروفیسر ایوب صابر کے اخلاص، جذبے اور اہلیت کو دیکھتے ہوئے ان سے یہ درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ اقبال دشمنی کے اس پوشیدہ روّیے کا بھی محاکمہ کریں جو علامہ کے چند نادان دوستوں کے ہاں صاف نظر آتا ہے۔ اقبال مجدّدِ مُطلَق ہیں، اقبال تاریخ انسانی کے عظیم ترین شاعر ہیں، اقبال دنیا کے سب سے بڑے اور آخری مفکر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مبالغہ آرائیاں ان تہمتوں سے زیادہ مضر اور خطرناک ہیں جو منشی امین زبیری ایسے لوگوں نے اقبال پر لگائی ہیں۔ یہ غیر تربیت یافتہ اور ناپختہ ذہن کو اقبال سے بدظن کر سکتی ہیں۔

یہ کتاب پڑھ کر جہاں ایک فوری فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اقبال کی شخصی بڑائی بھی بالکل واقعاتی سطح پر سامنے آجاتی ہے، وہیں دنیائے شعروادب میں کارفرما بعض انسانی رویے اور ان کے محرکات ومقاصد بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ اقبال دشمنی جو کہیں نظریاتی مخاصمت ہے، کہیں فکر واندیشہ کی تنگ دامانی اور کہیں ذاتی حسد وعناد، اپنی اصل حقیقت میں ایک ایسا رویّہ ہے جو انسان ہونے کی بعض بنیادی شرائط کے منافی ہے۔ اس کا غیر اخلاقی پن تو ظاہر وباہر ہے، سب سے تشویشناک پہلو وہ غیر انسانی پن ہے جس سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔ اقبال سے کلی یا جُزوی اختلاف اپنی شدید ترین حالت میں بھی ایک سنجیدہ اور مخلصانہ ذہنی سرگرمی کے طور پر قابلِ غور ہو سکتا ہے لیکن انہیں غلاظت میں ملوث اور آلودہ کرنے کی سازشیں پوری قوت سے رد کر دیے جانے کے لائق ہیں۔ پروفیسر ایوب صابر نے ان سازشوں کو بے نقاب کر کے اقبالیات کا ''فرض کفایہ'' ادا کیا ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

نام کتاب : علامہ اقبال کا روحانی مقام

مرتب : انجم، محمد اقبال

ناشر : مدینہ کتاب گھر گوجرانوالہ

صفحات : ۱۰۴

قیمت : ۱۰۰ روپے

مبصر : محمد اصغر نیازی

علاّمہ اقبال کی شاعری اپنے حلقۂ اثر میں ساحری سے کم نہیں، اُن کے خطوط گاہے گاہے ملفوظات کا مزا دیتے ہیں اور ان کی ایسی دوسری تحریروں میں بھی ایسا مواد بکثرت مہیا ہے جس کی بنیاد پر روحانیّت اور رومانیت کا شیش محل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ لگتا ہے علامہ اس معاملے میں خاصے خود آ گاہ تھے انھوں نے اپنے کلام اور پیام میں جا بجا ایسے آ ثار اور نقوش چھوڑے ہیں جنھیں نشانِ راہ قرار دے کر ان کے روحانی مقام و مرتبہ کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

جاوید نامہ کے اپنے سفر آں سوئے افلاک کے لیے روانگی سے پہلے وہ ہمیں اپنے مرشدِ رومی کی اُنگلی تھامے حیران نظر آتے ہیں۔ عارف ہندی حضرتِ رومی سے پوچھتے ہیں:

گفت با رومی کہ ہمراہ تو کیست؟
در نگاہش آرزوی زندگیست

جواب میں رومی علاّمہ کا تعارف جن الفاظ میں کراتے ہیں ان سے علاّمہ کے روحانی مقام کی خبر ملتی ہے۔ افسوس اقبال انجم کی نظر وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ حیرت ہے، رومی بھی جیسے اُن کے روحانی مقام سے خنداں آ گاہ نہیں۔

اُن کا اسلوب بیان اور طرزِ تکلّم اسی بات کا پتہ دیتے ہیں:

مروی اندر جستجو ، آوررہ ئی
ثابتی با فطرتِ سیاروئی

ہر زماں از شوق بینالد چوں نال
می کشد او را فراق و ہم وصال
من ندانم چیست در آب و گِلش
من ندانم از مقام و منزلش

مرشدِ اقبال تو اقبال کے مقام و منزل سے نا آشنا رہے، خود اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہ تھے۔ ایسے میں اقبال انجم کی کاوش اگر کامیاب ہوگئی تو اُس کا کیا بنے گا۔ علاّمہ نے ''بانگ درا'' میں ایک مولوی صاحب کی کہانی سنائی ہے جس میں اقبال کے ایک شناسا سے اُن کے احوال پر رائے زنی کر کے اس مجموعۂ اضداد کی حقیقت معلوم کرنا چاہی ہے۔ اتفاق سے آنجناب کی اقبال سے براہ راست ملاقات ہوگئی تو اقبال نے اپنے بارے میں اس طرح صفائی پیش کی:

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت سے شناسا
گہرا ہے میرے بحرِ خیالات کا پانی
مُجھ کو بھی تمنّا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر ہیں ، واللہ نہیں ہے

جاوید نامے میں جب رومی و اقبال کا گذر فلکِ عطارد سے ہوا تو وہاں کے بے آب و گیاہ صحرا اقبال کو بڑے بھلے لگے۔ رومی نے اُسے بتایا کہ یہ مقامِ اولیا بھی ہے اور یہاں کی خاک کو ہماری خاک سے نسبت خاص ہے۔ دیکھیے، یہاں کیسے کیسے مردانِ مقامِ بلند مصروفِ سجدہ و قیام ہیں۔

اس خاکداں میں رومی کے جی میں کیا آئی کہ وہاں کے باسیوں سے اپنے شریک سفر کا تعارف ایسے جچے تُلے الفاظ میں کرایا کہ وہ اس پورے سفر نامے کا تعارف لگتا ہے،

گفت رومی ذرۂ گردوں نورد
در دلِ اُو یک جہانِ سُوز و درد
چشم جز بر خویش نکشادہٗ ئی
دل بکس نادا دہ ئی ہم آزادئی
تُند سیر اندر فراخائی وجود
من ز شوخی گویم او را ''زندہ رود''

دیکھیے جمال الدین افغانی اس تعارف سے کس قدر از خود رفتہ ہوتے ہیں۔

زندہ رود از خاکدانِ ما بگوی
از زمین و آسمانِ ما بگوی

خاکی و چوں قُدسیاں روشن بصر
از مسلمانان بدہ مارا خبر

بہرحال جناب اقبال انجم صاحب کو اس سلسلہ میں زیادہ کدو کاوش اور تحقیق و تفتیش کی زحمت نہ اٹھانا پڑی ہوگی بلکہ ان کی کتاب کو سرسری دیکھنے ہی سے لگتا ہے کہ فاضل محقق کو سارا مواد یہیں کہیں، ادھر اُدھر سے بآسانی مل گیا کیونکہ

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

اس اینٹ گارے سے کوئی بھی معمار ایسی ہی شاندار عمارت استوار کرسکتا ہے جس کی ایک جھلک زیر تبصرہ کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سرِ دست اقبال کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں جو اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۳ پر درج ہے۔ یہ خط علاّمہ نے محترمہ عطیہ بیگم کے نام لکھا تھا۔

.....لیکن اگر میری روح کے عمیق تریں خیالات کبھی پبلک پر ظاہر ہو جائیں۔ اگر وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں، کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن ضرور میری پرستش کرے گی.....

لیجیے، اقبال انجم صاحب کا مشن مکمل ہوگیا کیونکہ روحانی مقام کی انتہا اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے،

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

لمحہ فکریہ ہے کہ کیا علامہ اقبال کے روحانی مقام کی تعیین اس قدر اہم اور ناگزیر کام ہے کہ ہم اُن کے فکر و نظر سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس پر خامہ فرسائی اپنے آپ پر لازم کرلیں، جبکہ ان کا کلام اور پیام ہمارے غور و فکر اور دقّتِ نظر کا بدرجہ اُولیٰ مستحق ہے یا ان سے استفادہ اور استفاضہ صرف اس بات پر موقوف ہے کہ اُن کی شخصیت کو مزعومہ اور موہومہ روحانیت کے جامے سے ڈھانپ دیا جائے، اس طرح اور کچھ ہو نہ ہو، اُن کے اور ہمارے درمیان ایسے حجابات ضرور نمودار ہو جائیں گے کہ جنھیں ہم کم از کم اپنے طور پر دور کرنے سے معذور رہوں گے۔

کسی بڑے آدمی کے روحانی مقام و مرتبہ کا کشف اور اس کی تحقیق! معاف کیجیے گا جناب اقبال انجم! یہ کسی بھی محقق گرامی کے کرنے کا کام نہیں بلکہ انھیں زیب ہی نہیں دیتا۔ چہ جائے کے اس طرح کے جملے ان کے قلم سے ٹپک پڑیں۔

..... دنیائے روحانیت کی سب سے بڑی شخصیات اقبال کے در دولت پر رونق افروز ہوئیں۔ص ۸۴

آگے جو روایت بیان ہوئی ہے وہ عامیانہ طرز نگارش اور عوامی طرزِ قصہ گوئی کا شہکار ہے۔ اس روایت سے قطع نظر خود اقبال انجم صاحب اپنی اس کتاب کے ص نمبر ۶۹ پر لکھتے ہیں:

.....اقبال کی پسندیدہ رفاقتیں صفحہ ہستی پر نہیں بلکہ کتابوں کے اوراق میں اور کچھ زیر زمین تھیں۔

اس لیے آپ نے رہنمائی کے لیے کبھی رومی کو آواز دی، کبھی رازی کو پکارا کبھی سنائی کے فکر میں غوّاصی کی، کبھی.....

اقبال انجم صاحب نے اس روایت سے جو تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی اسے عقل وفہم کی بارگاہ میں کیا مرتبہ ملتا ہے، اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ذرا سوچیں کہ یہ کہیں حضرتِ راوی ہی کے ذہن کی اختراع تو نہیں! بہرحال ایسے راوی تو اقبال کے فکر وفن پر بات کرنے کی بجائے اس طرح کی کہانیوں سے توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو محققین اور ماہرین اقبال سے گلہ ہے کہ وہ کس وادی کی خاک چھان رہے ہیں۔

اب اگر آپ چاہیں تو یہ قصہ کتاب میں خود مطالعہ فرمالیں۔

زیرِنظر کتاب میں علاّمہ کے روحانی مقام کے حوالے سے رسول کریم ﷺ سے اُن کی محبت و عقیدت اور تعلقِ خاص کو خاص اہمیت دی گئی ہے لیکن خود اقبال انؒ کے حضور ہمارے خلاف جو استغاثہ پیش کرتے ہیں اور خاصا معنی خیز ہے۔

من اے میر اممؐ داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانی شمُرد ند

کسی شاعر کو صرف ایک غزل خواں شمار کرنا واقعی باعثِ عار ہوسکتا ہے کہ اس کے کلام کے بارے میں عام طور پر یہ قیاس کرلیا جاتا ہے کہ اس میں سوائے عریاں رومانیت اور رقیق تک بندی کے اور کچھ نہیں۔

اس کے برعکس اقبال شاعر کی اہلیت وفکر کا جو معیار بیان کرتے ہیں وہ قابل توجہ ہے یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ اس معیار پر علاّمہ خود بھی اور وہ خود اس معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتے ہیں۔

فطرتِ شاعر سراپا جستجوست
خالق و پرور دگارِ آرزو ست
شعر را مقصود اگر آدم گر ی است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

اس میں ذرہ بھی شک نہیں، اقبال کی شاعری اُن کے ایسے ہی اشعار کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ اس حوالے سے مجھے اقبال کا رشتہ ہندوستان کی جس شخصیت سے سب سے زیادہ استوار نظر آتا ہے وہ شیخ احمد سرہندی ہیں حالانکہ مجدد صاحب علامہ کے کلام میں بہت کم نظر آتے باین ہمہ وہ علامہ کے پیام میں سرعام اور برسربام بولتے نظر آتے ہیں۔ اقبال اور مجدد صاحب میں مشابہتیں بہت ہیں، بہت سہی لیکن مغائرتیں اور دوریاں بھی بہت ہیں۔ اب یہ محققین کے کرنے کا کام ہے، وہ اپنے تحقیقی کام کو تجدیدی اور تخلیقی رنگ دینے کی کوشش کریں تاکہ کوئی ڈھنگ کا کام سامنے آسکے۔

دراصل مجدد صاحب کے کارنامہ ہائے تجدید اس قدر نمایاں اور مؤثر وعام ہیں کہ انھیں منظرِ عام پر لانے کے لیے کسی ایسے ویسے محقق کی ضرورت نہیں۔ اُدھر علامہ کے کارہائے نمایاں کسی انور شاہ کاشمیری کی نظر

التفات کے منتظر ہیں اور یہ علمِ تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ وہ بس منتظر ہی رہ گئے۔ یا کوئی مولانا تھانوی ہی اُن کی مدد کر آتا جو لالے کی حنا بندی میں فطرت کی مدد کر کے انھیں حکیم الامت کے عالی مقام منصب کا صحیح معنوں میں اہل بنا دیتا شاید اس طرح مزارِ مجدد پر لبِ اقبال سے نکلنے والی اس عجیب دُعا کی اجابت برنگ دِگر نظر آتی۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی